ڈاکٹر مسرت بانو*

سوانح اور آپ بیتی کا حسین امتزاج "راہ رواں"

Abstract: *Bano Qudsia is a fabulist novelist and short story writer.Her autobiography "Rah E Rwan"is an important and pleasant addition to the autobiographies in Urdu. In it, she has not only narrated about her life experiences in sequence but also mentioned elegantly about the life history of her beloved husband, Ishfaq Ahmad. For this reason, it is called a beautiful interfusion of autobiography and memoire.*

انسانی فطرت میں انانیت اوراظہار ذات کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ دوسروں کو اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں، خوشیوں اور غموں، کارناموں اور سرگرمیوں کی روداد سنا کر خوشی اور اطمینان محسوس کرتا ہے اورآپ بیتی اظہار ذات کا موثر ذریعہ ہے۔ آپ بیتی کو سادہ لفظوں میں کسی شخص کی زندگی کے مختلف مراحل کا ترتیب وار بیان کہا جاسکتا ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک اس پر جو کچھ بیتا، جو اس نے شعوری اور ارادی طور پر تجربہ کیااور جو اس نے سیکھا وہ اسے آپ بیتی کے ذریعے دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس میں اگر آپ بیتی نگار چاہے تو اپنے حسب نسب اور خاندانی کوائف پر بھی روشنی ڈال سکتا ہے۔ محمد طفیل آپ بیتی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مختصر لفظوں میں آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے جو خود اس نے بے کم وکاست اور راست راست قلم بند کر دی ہو، جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں، اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کے سوا اس کی داخلی کیفیات کے حجرے میں بھی جھانک سکیں۔"(۱)

سوانح حیات کسی اہم شخصیت کی زندگی کا ایک ایسا تدریجی اور ترتیب وار بیان ہے جس میں اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی تاریخی و سیاسی، مذہبی و تہذیبی، تعلیمی و ثقافتی صورت حال کی عکاسی بھی کی گئی ہو۔ تاہم یہ عکاسی بالواسطہ طور پر ہوتی ہے اور سوانح نگار کی تمام توجہ بنیادی طور پر شخصیت کے محاسن و معائب کے بیان پر مرکوز ہوتی ہے۔ سوانح حیات اور آپ بیتی کے لیے فنی اصول و ضوابط بھی یکساں ہی ہیں۔ دونوں ہی کا مقصد کسی شخصیت کی زندگی کی داخلی و خارجی تصویر کشی کرنا ہے۔ دونوں ہی حالات و واقعات کے تجزیے میں

* اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج برائے خواتین شاہ پور (سرگودھا)

احتیاط کا تقاضا کرتی ہیں، دونوں ہی میں فرد کے ساتھ ساتھ معاشرے کی تصویر کشی ملتی ہے اور دونوں ہی میں واقعات کے انتخاب میں دقت نظری سے کام لینا پڑتا ہے۔ دونوں کا مقصد معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترویج کرنا ہے۔ ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین سوانح نگار کے نزدیک احتیاط کی چھلنی، اعتدال کی کسوٹی، نظر کی بلندی اور جذبات کی تہذیب کو ناگزیر خصوصیات ہیں(۲)تو ڈاکٹر اطہر قسیم ایک عمدہ سوانح کے لیے تین بنیادی عناصر تاریخ، فرد اور کہانی کو ایک خاص تناسب کے ساتھ ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔(۳)اور یہی عناصر ایک عمدہ آپ بیتی کے بنیادی اصولوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر الطاف فاطمہ کے مطابق ایک عمدہ سوانح نگار کسی فرد کی شخصیت کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی سیرت و کردار کا کوئی پہلو بھی پوشیدہ نہ رہے اور اس کے محاسن و معائب کو بلا جھجک پیش کرے(۴)اور ایک آپ بیتی نگار سے بھی یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی اور شخصیت کے ہر خوب وزشت کو بلا کم وکاست بیان کرے گا۔

فنی اعتبار سے آپ بیتی کسی مخصوص ہیئت کی پابند نہیں ہے۔ اس کا انحصار آپ بیتی نگار کی صوابدید پر ہے کہ وہ کس فریم ورک میں اپنے حالات وخیالات کو بیان کرتا ہے۔ آپ بیتی نگار کی افتادِ طبع، طرزِ فکر، اندازِ بیان اور طرزِ احساس کے علاوہ آپ بیتی لکھنے کی غرض و غایت بھی، ہیئت کے انتخاب اور تعین پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے آپ بیتی کی ہیئت، مواد اور موضوع کا انحصار عام طور پر آپ بیتی نگار کی نیت پر ہوتا ہے۔ معروف افسانہ نگار اور ناول نگار بانو قدسیہ کی آپ بیتی "راہ رواں" کے عنوان سے سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور کی جانب سے 2013ء میں منظرِ عام پر آئی۔ ابواب بندی کی تقسیم سے عاری 620 صفحات پر مشتمل اس آپ بیتی کا انتساب بانو قدسیہ نے اپنے بیٹوں انیق، انیس اور اثیر احمد کے نام کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں بانو قدسیہ نے 16 / بڑے عنوانات کو مزید چھوٹے چھوٹے عنوانات میں تقسیم کر کے اپنے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں۔ آپ بیتی سے پتہ چلتا ہے کہ اشفاق احمد کی وفات کے بعد بانو قدسیہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگیں لہٰذا انہوں نے اپنی یادوں کو قلم بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ بیتی کا اولین عنوان "گھر سے گھر تک (آغاز کتاب)" ہے جس میں بانو قدسیہ نے بتایا ہے کہ انہوں نے اس آپ بیتی کے ذریعے قارئین کو اپنے محبوب شوہر اشفاق احمد سے متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔(۵) تاہم آپ بیتی کے بغور مطالعے سے یہ حقیقت بتدریج سامنے آتی ہے کہ دراصل بانو قدسیہ نے خود بھی اپنی یادوں کی بازیافت سے اشفاق احمد کو سمجھنے اور ان سے متعارف ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو "راہ رواں" میں خود نوشت سوانح یا آپ بیتی کی بجائے سوانح نگاری کا رنگ حاوی نظر آتا ہے کہ اس میں آپ بیتی نگار کی بجائے اشفاق احمد کی ذات اور شخصیت کا بیان زیادہ ملتا ہے۔ مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ بانو قدسیہ اشفاق احمد کی اس قدر پرستار ہیں کہ خود ان کی اپنی زندگی ان کے شوہر نامدار کی ذات اور شخصیت کا عکس بن کر رہ گئی۔ اردو ادب کی دنیا میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی ازدواجی زندگی کی کامیابی، باہم اعتماد، ذہنی ہم آہنگی اور مزاج آشنائی کی مثال کہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔ "راہ رواں" میں انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں اشفاق احمد سے اپنی پہلی ملاقات کے بعد ان سے شادی کرنے، کرائے کے متعدد گھر بدلنے اور پھر ۱۲۱۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں اپنا گھر بنانے اور اسی گھر سے سفرِ آخرت پر روانہ ہو جانے تک کے تمام مراحل کو اس ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے کہ خود ان کی اپنی زندگی کے تمام ادوار اور حالات و واقعات مربوط انداز میں سامنے

آ گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان یادوں کو دہرا کر وہ دراصل اپنے محبوب شوہر کی مہربانیوں اور شفقتوں کا حق ادا کرنا چاہتی ہیں۔ آپ بیتی کا ابتدائی حصہ تذکرے کا سا رنگ لیے ہوئے ہے جس میں بانو قدسیہ نے خان صاحب (اشفاق احمد) کے والد ڈاکٹر بابا محمد اور ان کے آٹھوں بچوں کا تعارف کرواتے ہوئے اشفاق احمد کے پردادا محمد معظم خان تک اس سلسلے کو بڑھایا ہے جو پٹھانوں کے مہمند قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بانو قدسیہ کے مطابق اس قبیلہ کی آبرو اور پہلے قابل ذکر فرد دوست محمد خان تھے جو اشفاق احمد کے دادا تھے۔ بانو قدسیہ نے بابا دوست محمد خان کی وجاہت، خوب صورتی اور جمال پرست طبیعت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ اپنی کم صورت بیوی سے بد دل ہو کر حیدر آباد دکن ہجرت کر گئے تھے۔ انہوں نے بابا دوست محمد خان کے نجی حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور قارئین کی سہولت کے لیے اس خاندان کا شجرہ بھی دیا ہے۔ "لیڈی میکلیگن کالج سے ساندہ کلاں تک" کے زیر عنوان انہوں نے قیام پاکستان کے بعد اشفاق احمد کے خاندان کا اپنی والدہ (جنہیں بانو قدسیہ "ماں جی" لکھتی ہیں) کے ہمراہ مشرقی پنجاب کے گاؤں مکتسر سے لاہور ہجرت کرنے کے حالات وواقعات کو بیان کیا ہے۔ لاہور میں یہ خاندان پہلے چند روز ماڈل ٹاؤن میں مقیم رہا اور پھر مزنگ روڈ پر واقع ایک تین منزلہ مکان میں منتقل ہو گیا۔ لاہور میں انہی دنوں اشفاق احمد نے بی۔ اے پاس ہونے کے باوجود والٹن کیمپ میں ۵۶ روپے ماہوار پر جونیئر کلرک کی پوسٹ پر کام کیا۔ بانو قدسیہ نے اشفاق احمد کی شخصیت کا تجزیہ ان کے خاندانی پس منظر، ارتقائی مراحل اور ان کی قبائلی خصائص کی روشنی میں کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اشفاق احمد کے خاندانی حالات کے بیان کے پہلو بہ پہلو بانو قدسیہ اپنی زندگی کے مراحل بھی مربوط انداز میں بیان کیا ہے۔ اپنے حالات کے ضمن میں انہوں نے اپنی والدہ اور بھائی کے ہمراہ گورداسپور سے لاہور ہجرت کرنے کی داستان بھی مختصراً سنائی ہے۔ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد جنم لینے والے فسادات کے دوران اپنے خاندان کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان دنوں ان کا گورداسپور والا مکان ایک چھوٹے سے ریفیوجی کیمپ کی شکل اختیار کر گیا تھا کہ بے شمار لوگ جانیں بچانے کی خاطر ان کے ہاں مقیم تھے۔ اسی دوران ان کے ایک گھریلو ملازم نے ان کے گھر سے عین ملحق فوجی بیرکوں میں مقیم فوجیوں کی باتوں سے ان کے ناپاک ارادوں سے باخبر ہو کر ان کی والدہ کو بروقت چوکنا کر دیا اور وہ باہمت بیوہ اپنے بیٹے اور بیٹی کو لے کر آناً فاناً گورداسپور سے لاہور آ گئی۔ لاہور آنے کے بعد ان کی والدہ لیڈی میکلیگن کالج کی پرنسپل بن گئیں اور کالج کے احاطے ہی میں انہیں پرنسپل لاج میں رہائش بھی مل گئی۔ بانو قدسیہ نے لیڈی میکلیگن کالج میں اپنی فراغت کے مشاغل کو بیان کرتے ہوئے کالج کی دیگر پروفیسر خواتین خاص طور پر جمیلہ ظفر اور اقبال ملک کا تعارف بھی کروایا ہے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج میں اپنے داخلہ لینے اور ایم۔ اے اردو کے دوران اشفاق احمد سے تعارف حاصل کرنے کی تمام تفصیل بیان کی ہے۔ وہ اپنے ایم۔ اے اردو کرنے اور اشفاق احمد سے ملاقات کو قسمت کا لکھا قرار دیتی ہیں۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج میں اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر سعید، اثر صاحب، پروفیسر آفتاب، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، اور صوفی تبسم کا خاص طور پر تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اسی زمانے میں اشفاق احمد سے ان کے جذباتی تعلق کی ابتدا ہوئی۔ بانو قدسیہ اس بارے میں بات کرتے ہوئے اپنی شخصیت اور احساسات و جذبات کا تجزیہ بھی دلکش انداز میں کیا ہے:

"میں ایسا فقیر تھی جو مانگنے تو نکلے لیکن اپنی عزت نفس بچانے کے لیے کاسہ چھپائے رکھے۔ قرض مانگنے کی اشد ضرورت ہو لیکن ساتھ یہ آرزو بھی پال رکھے کہ یہ قرض کبھی واپس نہ مانگا جائے۔ بیٹی کا رشتہ خود ہاتھ جوڑ کر کرانے پر مجبور ہو لیکن مشہور یہ کر دے کہ لڑکے والوں نے پھیرے ڈال ڈال کر دہلیز توڑ دی ہے۔ میں وہ لڑکی تھی جو عاشق کو اغوا پر مجبور کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ گھر والے، معاشرہ، قانون سب عاشق کو مورد الزام ٹھہرائیں۔ ہنس ہنس کر یاری لگانے والی اور رو رو کر سارا کچا چٹھا بیان کرنے والی کا تضاد بڑا کربناک ہوتا ہے۔ ہم دونوں کے بنیادی تضادات نے ہماری شخصیت پر خوف کی مہر لگا دی تھی۔ اس خوف کا رنگ ہم دونوں میں یکساں نہ تھا۔ اشفاق خاں کا خوف شام کی دھندلی روشنی سے مشابہ تھا، جس میں نظر تو سب کچھ آتا ہے لیکن واضح کچھ نہیں ہوتا۔ میرے خوف کا رنگ بسنتی تھا۔ سارے میں سرسوں کھلی تھی۔ مجھے سارا سچ سرسوں کے کھیت کی طرح نظر آتا تھا۔ اسے ماننے کی ضرورت بھی نہ تھی لیکن اس سے مقابلہ کرنے سے میں بدکتی تھی۔"(۶)

اس کے بعد انہوں نے اپنے حالات زندگی کو مختلف گھروں میں منتقل ہونے کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ لہذا انہوں نے بتدریج "مزنگ روڈ سے کینال پارک 24۔ ایس"، "14۔ ایس، کینال پارک"، "450۔ این، سمن آباد"، "روم سے۔۔۔۔60۔ فیروز پور روڈ کا تعلق"، "455۔ این، سمن آباد"، "479۔ این، سمن آباد"، "6 3۔ جی۔ ماڈل ٹاؤن"، "75۔ جی، ماڈل ٹاؤن"، "121۔ سی، ماڈل ٹاؤن" وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت اشفاق احمد سے اپنے جذباتی تعلق، گھریلو مراسم، اشفاق احمد کے اٹلی جانے اور وہاں سے خط و کتابت کرنے، ان کے واپس آنے پر شادی اور پھر مختلف مکان بدلنے کے دوران اپنے نجی حالات پر مربوط انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اشفاق احمد کی خاندانی روایات کے مطابق انہیں خاندان سے باہر شادی کرنے کی اجازت نہ تھی، دوسری طرف ان کے مراسم بانو قدسیہ کے گھر والوں سے روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ بانو قدسیہ کی والدہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں اور وہ شادی جیسے اہم معاملے میں اپنی بیٹی پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ تاہم وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر بھی نہیں رکھنا چاہتی تھیں، لہذا انہوں نے بانو قدسیہ کی فکری رہنمائی میں اہم کردار ادا کیا۔ جب اشفاق احمد چار سال کے لیے اٹلی چلے گئے تو انہوں نے وہاں سے بانو قدسیہ اور ان کی والدہ سے مسلسل رابطہ رکھا۔ وہ انہیں باقاعدگی کے ساتھ خط لکھتے رہے جن میں بانو قدسیہ کے مطابق ان کے لیے روایتی انداز میں کوئی وعدہ تھا نہ امید دلانے والا کوئی جملہ، بس ایک ان دیکھا اور ان کہا تعلق دونوں طرف استوار تھا۔ انہوں نے جابجا اشفاق احمد کے خطوط جو انہوں نے ان کے اور ان کی والدہ کے نام اٹلی سے لکھے، نقل کیے ہیں۔ ان خطوط میں اشفاق احمد ان کی والدہ کو اٹلی میں اپنے حالات اور مشاہدات و تجربات کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اس دوران بانو قدسیہ اپنے ناول پر کام کرتیں اور فارغ وقت کو موسیقی سیکھنے میں استعمال کرتیں رہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک استاد کی خدمات بھی حاصل کیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنے استاد کا نام نہیں لکھا لیکن ان کی خواہش

پر ان کے ایک استاد "کدر پیا" کے کلام یعنی ٹھمریوں کا ۱۱/ صفحات پر مشتمل نمونہ نقل کیا ہے۔ اٹلی سے واپس آنے کے بعد اشفاق احمد اور بانو قدسیہ رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گئے، تاہم اشفاق احمد نے ابتدا میں اس شادی کے بارے میں اپنی والدہ کو کچھ نہیں بتایا۔ جب ان کی والدہ کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے اشفاق احمد سے تعلقات منقطع کر لیے جو بہت بعد میں جا کر استوار ہوئے۔ بانو قدسیہ نے اپنی اور اشفاق احمد کی زندگی کی یہ تمام تفاصیل مربوط انداز میں بیان کی ہیں۔

بانو قدسیہ نے اپنے گھریلو حالات کے بیان کے ضمن میں اشفاق احمد کے مزاج، طبیعت اور عادات و اطوار پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے ان کے کام کرنے کے انداز، معاملہ فہمی، اپنی بات دوسروں کو سمجھانے اور اسے قائل کر لینے کی خوبی، ان کی ذہانت اور جودت طبع، ان کی تخلیقی قوت اور ندرت فکر کو جابجا سراہا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی یادوں کو دہراتے ہوئے ایسے واقعات کا انتخاب کیا ہے جن سے نہ صرف آپ بیتی میں دلچسپی پیدا ہوئی ہے بلکہ اشفاق احمد کی شخصیت کے مختلف پہلو بھی واضح ہو کر سامنے آئے ہیں۔ وہ واقعے کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے اشفاق احمد کی شخصیت کے کسی خاص پہلو کو بیان کرتی ہیں اور اس کی تعریف و تحسین کے بعد ہی واقعہ بیان کرتی ہیں۔ لہٰذا آپ بیتی کا بیشتر حصہ اشفاق احمد کی ذات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ آپ بیتی سے پتہ چلتا ہے کہ بانو قدسیہ اشفاق احمد کی شخصیت سے بے حد متاثر ہیں اور انہوں نے زندگی بھر اپنے شوہر کی عادات و اطوار اور مزاج و فطرت کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔ ان کی وفات کے بعد بانو قدسیہ نے اکیلے بیٹھ کر ان کی عادات و اطوار کو یاد کیا اور ان کی شخصیت کے ایک ایک پہلو کو اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اشفاق احمد کی شخصیت کے خارجی اور داخلی خصائص قاری کے سامنے پیش کر دیے ہیں:

> "عمر کے ساتھ ساتھ زندگی کو لیمن ڈراپ کی طرح چوسنے کا فن خاں صاحب کی عادت بن گئی تھی۔ وہ بات کرتے تو کسی کا من پر سکون کرنے کے لیے، کھانا کھاتے تو کام و دہن کو خوش کرنے کے لیے۔ لباس پہنتے چاہے وہ کھدر کا کرتا ہی کیوں نہ ہو، بڑے اہتمام سے۔ سوچتے تو ایک ٹانگ زانو کھڑا کر کے دوسری ٹانگ کو آدھی چوکڑی کی شکل میں اس طرح رکھتے کہ دوسرے پاؤں کو ہاتھ سے ٹپٹپانے کے لیے خالی رکھتے۔ انہیں اس طرح نیم دراز آسن میں دیکھ کر لگتا جیسے آنند روپی کوئی سادھو کسی مٹھ میں سمادھی لگائے براجمان ہے۔ وہ ہر کام کو پورا وقت دے کر اس کا احترام کر کے اس پر پوری توجہ صرف کر کے کیا کرتے تھے۔ سرکہ ڈالنا ہو، انگیٹھی پر کباب لگانے ہوں، جڑی بوٹیاں کوٹنی ہوں، سکرپٹ لکھنا ہو، وہ کبھی بھاجڑ، بھگدڑ، بم پٹاخے سے بھاگ کر کام نہ کرتے۔"(۷)

آپ بیتی کے فنی اصولوں میں خود اظہاریت بنیادی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ خود نوشت کا بنیادی اور اولین مقصد اظہار ذات ہی ہے۔ جو کچھ ایک انسان پر گزری، بیتی اور جو کچھ اس نے شعوری اور لاشعوری طور پر تجربہ کیا، اسے دوسروں کے سامنے شعوری طور پر اور

سوچ سمجھ کر بیان کرنا ہی آپ بیتی کہلاتا ہے۔ مگر یہ آپ بیتی نگار کے ان شخصی اور ذاتی تجربات کا، غیر شخصی اور تخلیقی اظہار ہوتا ہے۔ آپ بیتی میں خارجیت و داخلیت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہوتا ہے کہ یہ بیک وقت انفرادی اور آفاقی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ایک اچھی آپ بیتی فرد کا رشتہ پوری انسانیت سے جوڑتی ہے اور اسے کائنات کا محور و مرکز بنا کر اس کی انا کی تسکین کا باعث بنتی ہے۔ ایک ادیب جب اپنی آپ بیتی میں اپنے حالات زندگی بیان کرتا ہے تو وہ واقعات و حالات کا تجزیہ اپنے ماحول اور سماج کے مختلف تناظرات میں کرتا ہے جس سے اس مخصوص دور کی تاریخی، تہذیبی، معاشی اور سماجی صورت حال اپنی اصل شکل میں سامنے آتی ہے۔ آپ بیتی ایک فنکار کی شخصیت اور ذات کا اظہار ہے اور ادبی سماجیات کی رو سے وہ فنکار ایک جیتے جاگتے انسان کی شکل میں ایک مخصوص سماج کی اکائی ہے اور اس حیثیت سے وہ ایک سماج کے مختلف معاشی، معاشرتی، نفسیاتی، مذہبی اور سیاسی پہلوؤں کا عکاس ہے۔ وہ جہاں ایک مرد یا عورت، بیٹا یا بیٹی، شوہر یا بیوی، بھائی یا بہن، ماں یا باپ کی حیثیت سے ایک گھر کا نمائندہ ہے، وہیں وہ ایک سماج کی پہچان بھی ہے۔ لہذا کسی بھی فرد کی آپ بیتی کا مطالعہ بالواسطہ طور پر اس کی ذات کے حوالے سے اس کے سماج اور تہذیب کا مطالعہ بن جاتا ہے۔ آپ بیتی اظہار ذات کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں آپ بیتی نگار خود اپنی صورت دیکھ کر اس پر تنقیدی انداز نظر سے روشنی ڈالتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے محاسن و معائب کو بے لاگ انداز سے بیان کرتا ہے بلکہ اپنی شخصیت و کردار کا ناقدانہ جائزہ لیتا ہے۔ اپنی زندگی کے اہم واقعات و حالات بیان کرتے ہوئے وہ اپنے اعمال و افعال کو ایک "غیر" کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کے صحیح و غلط ہونے کا تعین غیر جانبداری اور منطقی دلائل کے ساتھ کرتا ہے۔ اس سے آپ بیتی میں توضیحی نثر کی شان پیدا ہوتی ہے اور یہ توضیح نفسیاتی، سماجی، مذہبی، سیاسی اور تہذیبی حوالوں سے ایک اہم دستاویز کی نوعیت اختیار کر لیتی ہے جو مستقبل میں انسانی اور سماجی صورت حال کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ بانو قدسیہ کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک بھرپور تخلیقی قوت کی مالک مصنفہ ہونے کے علاوہ ایک ذمہ دار بیوی اور شفیق ماں بھی ہیں۔ انہوں نے زندگی بھر اپنے تمام رشتوں کو خلوص کے ساتھ نبھایا، شوہر کی خدمت گزاری اور اطاعت شعاری کی بہترین مثال قائم کی، اپنے روٹھے سسرالی عزیزوں کے دل اپنے کردار کی عظمت سے جیت لیے، اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اپنی ادبی مصروفیات کے پہلو بہ پہلو اپنے عظیم شوہر کے دوستوں، ہم عصر ادیبوں اور ملنے والوں کا بھی اس طرح خیال رکھا کہ "آپا" ان کے نام اور شخصیت کا حصہ بن گیا، تاہم آپ بیتی میں انہوں نے اپنی زندگی کی ہر کامیابی کو اپنے شوہر کی فہم و فراست اور تعاون کا حاصل قرار دیتے ہوئے اپنی ذات اور شخصیت کو پس منظر میں رکھا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے روزمرہ کے معمولات کو بیان کرتے ہوئے اپنی شخصیت کا دلکش انداز میں تجزیہ کیا ہے جس سے آپ بیتی میں فلسفے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اشفاق احمد سے اپنی محبت کا ذکر کرتے ہوئے شوہر کی محبت اور ذات کو اپنی ملکیت سمجھنے کے تصور کو ہندوانہ تہذیب کے اثرات کی دین قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"میری روح ہندو استری کی تھی۔ میں پتی دھرم اور پتی بھگتی کے مسلک پر کاربند تھی۔ میری ڈکشنری میں ابھی اسلامی شادی کا کوئی تصور نہ تھا۔ تعدد ازواج، طلاق، خلع، پسند کی شادی، برابری کا دعویٰ، منفرد حیثیت وغیرہ میرے نزدیک گالی تھی۔ میں گو آواگون کی تشریح کو بھی بخوبی نہ سمجھتی تھی لیکن میرے نزدیک ایک ہی شوہر سے جنم مرن کا ساتھ تھا۔ ہندو دھرم کے اس پہلو پر یقین رکھتے ہوئے میں پکی Monogamist تھی۔ ممتاز مفتی نے سب سے پہلے میری اس خوبی یا قباحت کو بھانپ کر مجھ پر مضمون لکھا تھا۔ جب تک خاں صاحب گھر رہتے، میں سائے کی طرح ان کے پیچھے لگی رہتی۔ مجھے ہر لحظہ ان سے بچھڑ جانے کا خوف رہتا۔ جونہی وہ مرکزی اردو بورڈ چلے جاتے میں لکھنے لکھانے میں مشغول ہو جاتی۔ بچے اسکول سے لوٹتے، باورچی خانے میں بیٹھ کر ہم کھانا کھاتے۔ پھر ہم چاروں سو جاتے۔ سر پر سے بلا ٹالنے کے انداز میں مَیں انہیں کھانے کی میز کے گرد بٹھا کر پڑھاتی۔ نہ مجھے ان کی پڑھائی کا خاطر خواہ علم تھا نہ میں سائنس کے متعلق کچھ جانتی تھی۔ مجھے ان کی تربیت کی کوئی سمجھ بوجھ نہ تھی۔"(۸)

مجموعی طور پر بھی "راہ رواں" میں جا بجا تفکر اور فلسفے کی روشنی میں زندگی کے عام حالات واقعات اور روزمرہ زندگی کے معمولات کی تفہیم کا انداز پایا جاتا ہے۔ بانو قدسیہ اپنے عمل اور سوچ کی توضیح اور اشفاق احمد کے فکر و عمل کی وضاحت کے سلسلے میں تاریخ اور تہذیب کے ابتدائی ادوار سے مدد لیتی ہیں اور حال کا رشتہ ماضی کے ساتھ جوڑتے ہوئے ماضی کو حال میں موجود دکھاتی ہیں۔ وہ اشفاق احمد کے مزاج میں پٹھانوں کے مہمند قبیلے کے خصائص اور فطری عادات کے اثرات کا جائزہ لیتی ہیں اور ان کے سیاسی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے سیاسی نظریات کا سلسلہ تاریخ کے ڈانڈوں سے ملا دیتی ہیں۔ خان صاحب کے سیاسی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اشفاق احمد کی تحریروں کی روشنی میں تحریک پاکستان کو فلسفیانہ انداز نظر سے دیکھا ہے اور برصغیر میں آریاؤں کی آمد کے بعد یہاں کی سماجی طبقاتی تقسیم اور اسلام کے اثرات و نفوذ پر بھی فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اپنے استدلال کی وضاحت کے لیے انہوں نے ہندو دیومالا اور مہابھارت سے متعلق اشفاق احمد کی ۱۱/ صفحات پر مشتمل ایک تحریر کو بھی نقل کیا ہے۔

بانو قدسیہ نے اپنی زندگی کے حالات و واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے اشفاق احمد کے قریبی احباب کا ذکر بھی کیا ہے۔ اردو ادب کی دنیا میں اشفاق احمد، مفتی جی اور قدرت اللہ شہاب کو ایک مثلث کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ قدرت اللہ شہاب پر اپنے دوستوں کو نوازنے کا جو الزام لگایا جاتا ہے اس کی ایک جھلک "راہ رواں" میں دکھائی دیتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا قدرت اللہ شہاب اپنے دوستوں کو بڑی سے بڑی پوسٹ کھڑے کھڑے عطا کر دیتے تھے۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں کہ جب شاکر علی میوزیم بن رہا تھا تو ایک دن قدرت اللہ شہاب ان کے ہاں آئے اور کہا کہ اس میوزیم کے لیے ایک عدد ڈائریکٹر کی ضرورت ہے اور اگر وہ چاہیں تو وہ بآسانی یہ

پوسٹ انہیں دلوا سکتے ہیں۔ انہوں نے اس آفر میں انہیں اچھی تنخواہ، دو عدد گھریلو ملازم اور سفر کے لیے سرکاری مراعات کے پیکج کے بارے میں بھی بتایا۔ تاہم بانو قدسیہ نے اشفاق احمد سے مشورہ کرنے کے بعد اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا(۹) آپ بیتی سے پتہ چلتا ہے کہ شہاب نے اپنی صوابدید پر اشفاق احمد کو مرکزی اردو بورڈ میں ڈائریکٹر کی پوسٹ دلوائی اور انشاجی کو لندن میں انڈیا آفس کی لائبریری کا ڈائریکٹر بنوا دیا:

> "عین 17 جون 1967ء کو خاں صاحب کو قدرت اللہ شہاب نے بیسویں گریڈ کا ڈائریکٹر بنا دیا۔ شہاب بھائی ان دنوں سیکرٹری ایجوکیشن تھے۔ اس کے ساتھ انہوں لندن میں انڈیا آفس کی میموریل لائبریری کا ڈائریکٹر انشاجی کو بنا دیا۔"(۱۰)

اشفاق احمد ریڈیو اور ٹی وی پر کام کرتے تھے اس لیے متعدد فنکاروں کا ان کے ہاں آنا جانا تھا۔ اپنی زندگی کی یادوں کو دہراتے ہوئے بانو قدسیہ نے اپنے گھر آنے جانے والے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کا بھی بھرپور انداز میں تعارف کروایا ہے۔ وہ شخصیت کا تعارف کرواتے ہوئے اپنے مشاہدات کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات کو بھی سادگی سے پیش کر دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے مخصوص اسلوب اور تشبیہہ و استعارہ کی مدد سے مختصر مگر پر اثر انداز میں شخصیت کی تمام نمایاں خوبیوں کو بیان کر دیتی ہیں۔ نور جہاں کو انہوں نے جب پہلی بار سکرین سے باہر دیکھا تو ان کا لباس، حلیہ اور زیورات تک کی تفصیل بیان کرتے ہوئے *ان کے بارے میں لکھتی ہیں:*

> "سامنے سفید ساڑھی میں ملبوس برف پوش پہاڑ کی چوٹی کی طرح اللہ کا ایک خوب صورت منظر کھڑا تھا۔ موٹاپے کے باوجود اس کے حسن میں کہیں کمی نہ تھی۔ بالوں میں ایک سفید پھول، ہاتھوں میں ہیرے جڑی چوڑیاں، گلے میں ہار، انگوٹھیاں۔ نور جہاں مکمل طور پر نسوانیت کی پوری طاقت سے لیس ترغیب کی ایک تصویر تھی۔"(۱۱)

چونکہ فرد سماج کی بنیادی اکائی ہے اور اس کے اعمال وافعال کی اصل تصویر سماج کے چوکھٹے میں رکھ ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ لہذا آپ بیتی نگار اپنے حالات زندگی کے بیان کے ضمن میں اپنے اردگرد موجود لوگوں کی شخصیت اور کردار پر بھی روشنی ڈالتا ہے جس کا بنیادی مقصد خود آپ بیتی نگار کی زندگی کو سماج کے آئینے میں دکھانا ہے۔ ایک ادیب جب آپ بیتی لکھتا ہے تو وہ اپنے دوست احباب کے علاوہ اپنے ہم عصر ادیبوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی وضاحت اس انداز سے کرتا ہے کہ اس خود آپ بیتی نگار کی شخصیت اور حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح شخصیت نگاری آپ بیتی کا لازمی جزو قرار پاتی ہے۔ تاہم شخصیت نگاری کے ضمن میں آپ بیتی نگار شخصیت کے کن پہلوؤں کو اہمیت دیتا ہے اور انہیں کس انداز سے بیان کرتا ہے، اس سے خود آپ بیتی نگار کے ذہنی و نفسی میلانات کی عکاسی ہوتی ہے۔(۱۲) آپ بیتی میں اپنی زندگی اور اپنے متعلقہ لوگوں اور دوست احباب کے حالات و واقعات کا انتخاب آپ بیتی نگار کی صوابدید پر ہوتا

ہے،یعنی وہ اس معاملے میں مکمل طور آزاد ہوتا ہے کہ وہ کون سے حالات و واقعات کو بیان کرے اور کون سے واقعات کو بیان نہ کرے۔لہذا یہ ممکن ہے کہ وہ تمام یا کچھ حقائق کو چھپالے،یا پھر مبالغے سے کام لے اور حقائق کو توڑ مڑوڑ کر پیش کرے۔بعض اوقات آپ بیتی نگار قاری کی فکر سازی اور ایک مخصوص ذہنی رویے کی تشکیل کے لیے حقائق و واقعات پر من چاہا رنگ چڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔لہذا کچھ آپ بیتیاں لکھنے والے کی خود ستائی اور مبالغہ آمیز داستان طرازی کا پلندہ ہوتی ہیں تو کچھ ان کے مصنفین کے مخالفین اور ناپسندیدہ لوگوں کی تنقیص،عیب جوئی،الزام تراشی اور طنز و تشنیع کا مرقع ہوتی ہیں۔(۱۳)لوگ لوگ" کے زیر عنوان بانو قدسیہ نے اپنی اور اشفاق احمد کی زندگی میں آنے والے اہم لوگوں کے بارے میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے ہیں کہ خود ان کی زندگی کے مختلف پہلو بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ان میں محمد یحییٰ خان،میرزا ادیب،صوفی غلام مصطفیٰ تبسم،چچا غلام علی،قراۃ العین حیدر،مفتی جی،عبد الرحمن چغتائی،انتظار حسین،احمد ندیم قاسمی،آذر زوبی،الطاف فاطمہ،محسن احسان،ڈاکٹر انور سجاد،انور خاور،واجدہ تبسم،ڈاکٹر وزیر آغا،ڈاکٹر انور سدید،بشریٰ رحمن،منیر نیازی،احمد فراز،مسعود کھدر پوش،احمد علی،ذوالفقار احمد تابش،اصغر ندیم سید،اجمل نیازی،پیسی سدھوا،افضل توصیف،مستنصر حسین تاڑڑ،افتخار عارف،امجد اسلام امجد،عطاالحق قاسمی،یاسمین حمید،احمد عقیل روبی،محمد یونس بٹ جیسے ادیبوں کے علاوہ ٹیلی ویژن کے چند لوگ اور اشفاق احمد کا علاج کرنے والے کچھ ڈاکٹر بھی شامل ہیں۔شخصیت نگاری کے ضمن میں بانو قدسیہ کا انداز بیان ان کی صاف شفاف شخصیت،کردار کی عظمت،انسان دوستی اور بلند نظری کا آئینہ دار ہے کہ انہوں نے شاعروں اور ادیبوں کے اس جمگھٹے میں سے کسی کی بھی کردار شکنی کی کوشش نہیں کی اور صرف انہی باتوں اور واقعات کو آپ بیتی میں جگہ دی جس کا تعلق ان کے اور اشفاق احمد کے ساتھ گزارے لمحات سے تھا۔

کسی بھی آپ بیتی کی کامیابی اور دلچسپی کا انحصار واقعات کے انتخاب پر ہوتا ہے۔واقعات کے انتخاب میں اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ ایسے واقعات بیان کیے جائیں جن سے آپ بیتی نگار کی زندگی کے کسی خاص پہلو کی تصویر کشی ہوتی ہو یا ان سے اس کی شخصیت کے کسی اہم پہلو کی عکاسی ہوتی ہو۔واقعات کے انتخاب میں خارجی زندگی کے ساتھ ساتھ نجی زندگی کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ نجی زندگی کے بیان کے بغیر آپ بیتی ایک تذکرے یا تاریخ کی حیثیت اختیار کرلے گی۔اس کے ساتھ ساتھ آپ بیتی میں پیش کیے جانے والے حالات و واقعات سے ایک خاص زمانے کی تہذیبی و سیاسی،معاشی و معاشرتی اور اخلاقی و مذہبی صورت حال کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔لہذا ایک آپ بیتی نگار کو اپنی قوت فیصلہ،ذوق انتخاب اور شعوری کاوش کے ذریعے ان واقعات کا انتخاب کرنا چاہیے جن سے نہ صرف اس کی اپنی زندگی متاثر ہوتی ہے بلکہ سماجی اہمیت کے اعتبار سے بھی وہ قاری کے لیے مفید ثابت ہوں۔"راہر واں "تحریر کرنے کا مقصد چونکہ اشفاق احمد کی باتوں اور ان کے ساتھ گزارے وقت کی یادوں کو دہرانا تھا اس لیے بانو قدسیہ نے بیشتر وہی واقعات منتخب کیے ہیں جن اشفاق احمد کی شخصیت،ان کی ادبی و تخلیقی خدمات یا ان کے دوست احباب کے تعارف کا کوئی پہلو پایا جاتا ہو۔اسی ضمن میں انہوں نے اپنی

زندگی کے اہم واقعات کو بھی راست انداز میں بیان کیا ہے۔ اپنی کتاب "امر بیل" کی رونمائی اور فیض صاحب کے اس تقریب کی صدارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

جب میری کتاب "امر بیل" چھپی تو اس کا فنکشن در پیش تھا۔ ہمارا معیار زندگی بڑھ چکا تھا۔ ایک روز ہم فیض صاحب کو ان کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے تو میں نے بڑی جرأت رندانہ سے کہا۔ "فیض صاحب ! میری کتاب کا فنکشن ہو رہا ہے۔ کیا آپ اس کی صدارت کر دیں گے؟"

"کر دیں گے۔" انہوں نے سادگی سے کہا۔ "کارڈ بھجوا دینا۔"

واپسی پر خان صاحب کہنے لگے۔ "بھئی اتنے بڑے شاعر کو صدارت کے لیے کہتے ہوئے تمہیں خوف نہیں آیا؟"
بخدا ان کی بڑائی کا مجھ پر اس وقت کوئی تہور موجود نہ تھا۔ فنکشن ہوا۔ اس میں باب ہیز نے مجھ پر مضمون پڑھا۔ خاں صاحب، احسان اکبر، سہیل عمر اور اصغر ندیم سید نے بڑے پُر مغز مضمون پڑھے اور وہ خوبیاں بیان کیں جو نہ کتاب میں تھیں نہ صاحب کتاب میں۔"(۱۴)

بابا نور والے اور دیگر" کے عنوان کے تحت انہوں نے اشفاق احمد کے صوفیانہ مسلک کی وضاحت کی ہے اور اس سلسلے میں مختلف روحانی بزرگوں اور "بابوں" سے فیض یاب ہونے کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہاں بانو قدسیہ نے قدرت اللہ شہاب کی بیگم عفت شہاب کی بیماری اور اس سلسلے میں ان کی پریشانی اور مسائل پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس بارے میں خود قدرت اللہ شہاب نے "شہاب نامہ" میں خاموشی اختیار کی تھی۔ اس کے علاوہ بانو قدسیہ نے "برکلے ایکسچینج" پروگرام کے بارے میں بھی بتایا ہے جس کے تحت یورپی طالب علموں کا تبادلہ پاکستان کیا جاتا تھا اور پاکستان سے ادیبوں، طالب علموں اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے قابل ذکر افراد امریکہ کا دورہ کرتے تھے۔ اس پروگرام کے تحت اشفاق احمد کا گھر بھی "میزبان" کی حیثیت سے چنا گیا تھا۔ خود اشفاق احمد اسی پروگرام کے تحت 1963ء میں امریکہ مدعو ہو چکے تھے اور اب انہوں نے غیر ملکی مہمانوں کو اپنے گھر میں مہمان رکھ کر انہیں پنجابی رسم و رواج، رہن سہن اور تہذیب و ثقافت سے روشناس کروانے کی ذمہ داری نبھائی۔ بانو قدسیہ نے اس پروگرام کے تحت اپنے ہاں آنے والے یورپی افراد کا تعارف کروایا ہے اور قیام کے دوران ان کے تجربات و مشاہدات کو بیان کیا ہے۔ ان میں باب ہیز، کیتھی، مارسیا، کرسٹوفر، اینڈریوز اور جوئی شامل ہیں۔

سفر در سفر" میں انہوں نے اپنی بیماری اور بلڈ کینسر کے علاج کے سلسلے میں سفر لندن کا احوال بیان کیا ہے اور اوسلو اور دراوڑ کے سفروں کی تفصیل بھی پیش کی ہے تاہم انہوں نے آپ بیتی کو سفر نامہ بنانے کی کوشش نہیں کی اور بیشتر توجہ اپنے اور اشفاق احمد کے حالات زندگی کے بیان پر مرکوز رکھی ہے۔ "آخری یام (گھر کو واپسی)" کے عنوان کے تحت انہوں نے خان صاحب کی بیماری اور سفر آخرت پر روانگی

کی تفصیل بیان کی ہے اور اس دوران اپنے احساسات وجذبات کو بھی پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔اس حوالے سے "راہ رواں" کو اردو کی ایک اہم اور عمدہ آپ بیتی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں داخلیت اور خارجیت کا ایک حسین اور متوازن امتزاج دکھائی دیتا ہے۔بانو قدسیہ ہر مسئلے اور ہر واقعے پر اپنے تاثرات اور داخلی احساسات وجذبات کو بھی دلکش انداز میں بیان کرتی ہیں۔اشفاق احمد کی بیماری کے دوران اپنی دلی اور ذہنی کیفیت کے بارے میں بات کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"کچھ تو خاں صاحب کی بیماری نے کمر توڑ دی تھی کچھ نفسیاتی، قلبی، ذہنی طور پر میں خوف سے تتری تتری ہو گئی تھی۔ایک خوش الحان، راست گو ساتھی سے بچھڑنے کا برا خواب ہر وقت ساتھ تھا جسے میں مگس راں سے اڑاتی رہتی تھی، لیکن نہ خوابِ درماندہ پیچھا چھوڑتا تھا نہ ہونی ٹلتی ہی نظر آتی تھی۔"(۱۵)

زبان کی لطافت، تراکیب کی دل آویزی، الفاظ کی موزونیت اور بیان کا حسن آپ بیتی کو ادبی فن پارے کا درجہ دلاتے ہیں۔اسلوب میں لکھنے والے کی شخصیت، اس کا طرز فکر، اس کا مزاج، اس کی تحریر کے شعوری اور لاشعوری تشکیل پاتا ہے۔خالد محمود خان، اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہر فکشن رائٹر اپنی مخصوص شخصیت، تربیت، تعلیم، ماحول، ثقافت اور اپنی ذاتی اقدار رکھتا ہے اور اس کی تحریر پر ان عوامل کا گہرا اثر ہوتا ہے۔اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے نہ صرف وہ منفرد رہتا ہے بلکہ نہایت منفرد انداز میں قابل شناخت بھی۔"(۱۶)

"راہ رواں" بانو قدسیہ کے مخصوص اسلوب کی آئینہ دار ہے۔اس میں فکر وفلسفے کی روشنی بھی ہے اور علمیت و ادبیت کی چاشنی بھی۔اردو میں کہیں کہیں پنجابی الفاظ کے استعمال نے اسلوب میں دلکشی پیدا کی ہے۔بانو قدسیہ روز مرہ زندگی کی عام اشیا سے تشبیہات کشید کرتی ہیں جن سے مانوسیت کے ساتھ ساتھ انفرادیت بھی پیدا ہوتی ہے:

ان کی محبت ایسی تھی جیسے اعجوہ کھجوریں خالص شہد میں ڈوبی ہوتی ہیں۔"(۱۷)

جہاں تک نقل کا تعلق ہے وہ درست تھی لیکن ان کے بھانویں کچھ کسر تھی۔"(۱۸)

"مجھ میں ایک کمال کی کم عقلی موجود ہے جو ثابت کرتی ہے کہ میں "رج" کے ناقص العقل ہوں۔"(۱۹)

"نور جہاں نے مجھ پر ایک ایسی نظر ڈالی جیسے کاٹھ کباڑ سے لدے گودام کو دیکھ رہی ہو۔"(۲۰)

دونوں میں نُکی نُکی گفتگو جاری رہتی۔"(۲۱)

مجموعی اعتبار سے "راہ رواں" کو ایک عمدہ آپ بیتی قرار دیا جا سکتا ہے جس میں بانو قدسیہ کی زندگی کے تمام ادوار کا ایک مکمل، مربوط اور مسلسل بیان ملتا ہے۔ اس میں ان کی زندگی میں پیش آنے والے تمام اہم واقعات و حالات کی مبنی بر حقائق تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ نہ صرف ان کی زندگی کے خارجی حالات و واقعات کا تدریجی بیان ہے بلکہ ان واقعات و حالات پر ان کے داخلی احساسات و جذبات اور تاثرات کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ سادہ و دلکش انداز بیاں کی حامل ہونے کے باوصف اس میں ادبیت کا گہرا رچاؤ اور علمیت کی روشنی پائی ہے۔ تاہم بانو قدسیہ نے آپ بیتی میں جابجا اشفاق احمد کی تحریروں سے اقتباسات، ان کے مضامین اور اشفاق احمد سے متعلق دوسروں کے تاثراتی مضامین بھی نقل کیے ہیں جس سے نہ صرف آپ بیتی کی ضخامت میں بے جا اضافہ ہوا ہے بلکہ فنی تاثر بھی مجروح ہوا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے اسلوب پر فلسفے کی چھاپ ہے اور وہ اپنے خیالات و نظریات کی وضاحت اپنے مخصوص نقطہ نظر کی روشنی میں کرتی ہیں جس سے کہیں کہیں اسلوب بوجھل محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے صفحہ 256 تا 269 ریاض محمود کا پوار مضمون نقل کیا ہے۔ اسی طرح 269 تا 274 اسلم کولسری کا مضمون نقل کیا ہے۔ 287 تا 290 شادی اور خاندانی نظام پر مشتمل ہے۔ صفحہ 305 تا 318 اپنے بیٹوں کی شاعری کے نمونے نقل کیے ہیں۔ صفحہ 319 تا 335 "خاں صاحب کا سیاسی مسلک" کے عنوان کے تحت برصغیر کی قدیم تاریخ پر مباحث پر مشتمل ہے۔ اسی طرح انہوں نے صفحہ 368 تا 371، اشفاق احمد کا مضمون "سُرخا" نقل کیا ہے اور اس سے پہلے اس تحریر کا پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ بڑھاپے سے متعلق اشفاق احمد کے اقوال، لوک دانش پر مبنی ان کے اقوال، ان کا مضمون "چاند کا سفر" اور دیگر تحریریں بھی نقل کی ہیں اور خالدہ حسین، جمیلہ ظفر، محمد جاوید پاشا، نورالحسن، ڈاکٹر آصف گوہیر اور ممتاز مفتی کے تاثراتی مضامین بھی پیش کیے ہیں۔ انہوں نے ممتاز مفتی کی شخصیت کشی کرتے ہوئے ان کا اپنے بارے میں لکھا ہوا خاکہ بھی نقل کیا ہے۔ اسی طرح آپ بیتی کے آخر میں مسعود میاں کے دو مضامین بعنوان "اشفاق احمد کی یاد میں" اور "راجہ گدھ: ایک تاثر" بھی نقل کیے ہیں جو 15 صفحات پر محیط ہیں۔ علاوہ ازیں آپ بیتی میں بانو قدسیہ نے لاہور کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کی کچھ واضح انداز میں عکاسی نہیں کی اور اپنی بیشتر توجہ اپنے گھریلو حالات، نجی زندگی اور اشفاق احمد کی ذات اور شخصیت کی تصویر کشی تک محدود رکھی ہے جس سے آپ بیتی میں تشنگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی ملکی سیاسی، سماجی یا تہذیبی حوالہ آپ بیتی میں آیا محرکات، اس کی نفسی کیفیات اور فطری رجحانات، اس کا عہد اور ماحول، سب کی امتزاجی کیفیت کارفرما ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں فرد کی شخصیت و مزاج کے داخلی رنگ اور اس کے ماحول کے خارجی اثرات کے مرکب امتزاج سے اسلوب بھی ہے تو وہ ان کی ذاتی زندگی کے بیان کے ضمن میں ہی آیا ہے۔ اس خامی سے قطع نظر "راہ رواں" بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کی زندگی کے تمام اہم حالات و واقعات کو مربوط انداز میں بیان کرتی ہے اس لیے اس کا شمار اردو کی اہم اور مکمل آپ بیتیوں میں کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ محمد طفیل، "تصریحات"، "نقوش"، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، 1964ء

۲۔ امیر اللہ خاں شاہین، "فن سوانح نگاری"، مشمولہ، فن سوانح نگاری اور دیگر مضامین دہلی، طاہر بک ایجنسی، 1973ء) ص۔124

۳۔ اطہر قسیم، ڈاکٹر، "اردو کی آپ بیتیاں۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ" غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی۔ ایچ ڈی، نمل، اسلام آباد، 2007ء، ص۔28

۴۔ الطاف فاطمہ، "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا"، (کراچی، اردو اکیڈمی۔ اپریل 1961ء) ص20

۵۔ بانو قدسیہ، "راہ رواں" (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔ 2013ء) ص۔7

۶۔ ایضا، ص۔53 ۷۔ ایضا، ص۔ 398،397 ۸۔ 245،244

۹۔ ایضا، ص۔299 ۱۰۔ ایضا، ص۔256 ۱۱۔ ایضا، ص۔253

۱۲۔ بشری ثمینہ، ڈاکٹر، "اردو میں شخصیت نگاری: تحقیقی و تنقیدی جائزہ (دور سر سید سے 1958 تک)، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، 2008ء، ص۔7

۱۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر "خود نوشت اور اردو خود نوشت"، مشمولہ، بلاجواز (کچھ اپنے بارے میں)، (لاہور، الوقار پبلی کیشنز۔ 2011ء) ص۔392،391

۱۴۔ ایضا، ص۔281 ۱۵۔ ایضا، ص۔457

۱۶۔ خالد محمد خان، "فکشن کا اسلوب"، (ملتان، بیکن بکس۔ 2014ء) ص۔29

۱۷۔ بانو قدسیہ، "راہ رواں" (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔ 2013) ص۔202

۱۸۔ ایضا، ص۔234 ۱۹۔ ایضا، ص۔239 ۲۰۔ ایضا، ص۔253

۲۱۔ ایضا، ص۔382

☆☆☆☆☆